مخدوم: نظم کا انوکھا فن کار

ڈاکٹر اکبر مہدی مظفر
ڈاکٹر عزیز رضا

مخدوم اگر غزل کے ایک طرحدار شاعر تھے تو نظم کے بھی ایک انوکھے شاعر تھے ان کی شاعری کا آغاز تقریباً ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ اسی فکر و نظر کے بہاؤ میں ہوا۔ فیض اور مخدوم ترقی پسند نظریے سے متاثر دو ایسے شاعر تھے جو نہ صرف فکری طور پر اس میں شامل تھے بلکہ عملی طور پر بھی کمیونزم کی نمائندگی میں پیش پیش تھے اور جس طرح فیض کی شاعری کے موضوعات بڑے وسیع ہیں اسی طرح مخدوم کے بھی شعری موضوع کا پھیلاؤ آفاقی نظر آتا ہے۔

مخدوم کی شاعری کا آغاز ان کی تفریحی نظم 'پیلا دوشالہ' سے ہوتا ہے جس میں مسرت و بہجت کی گفتگو بہت دلچسپ انداز میں ہے۔ 'پیلا دوشالہ' سے قبل بھی ان کے کچھ شعری نمونے پائے جاتے ہیں لیکن ان کی شاعری کی ابتدا 'پیلا دوشالہ' سے ہی تسلیم کی جاتی ہے۔ یہ نظم طالب علمی کے دور کی ایک اتفاقی نظم ہے جس میں کچھ اشعار تقریباً موزوں ہو گئے ہیں اس میں طبیعت کی ہلکی پھلکی رنگینی، ستم ظریفی کے رنگ و آہنگ میں مستزاد کا روپ اختیار کر گئی ہے لیکن مزاج کی یہ شوخی وقتی ثابت ہوتی ہے اور اس کے بعد یہ مسکراہٹ کافور ہو جاتی ہے۔ مخدوم کے شعری موضوعات سرخ سویرا، گل تر اور بساط رقص میں متواتر بدلتے ہوئے ملتے ہیں اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا ذہنی سفر عمر کے آخر حصے تک یکساں نہیں رہتا ہے بلکہ مختلف سمتوں میں سفر کرتا رہتا ہے جس کے سبب ان کے شعری موضوعات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔

'سرخ سویرا' کی پہلی نظم 'طور' ہے جس میں وہ ایک رومان پرور شاعر نظر آتے ہیں مگر ان کی رومانیت میں زمینی خوشبو انگڑائی لیتی ہوئی ملتی ہے۔ اسی لیے ٹیپ کا مصرع

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

انھیں اپنے گاؤں اور دھرتی سے جوڑے ہوئے رکھتا ہے اور یہ محبت ان کی افسانوی نہیں بلکہ زمینی نظر آتی ہے اس نظم میں جو مناظر پیش کئے گئے ہیں وہ ایک عام زندگی سے بہت قریب ہیں:

بہے جاتے تھے بیٹھے عشق کے زریں سفینے میں
تمناؤں کا طوفاں کروٹیں لیتا تھا سینے میں
جو چھو لیتا میں اس کو وہ نہا جاتا پسینے میں
مئے دو آتشہ کے سے مزے آتے تھے جینے میں
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

اس بند میں جو پیکر طرازی ملتی ہے وہ بالکل اچھوتی نہیں ہے بلکہ اپنے عاشق کے پہلو بہ پہلو نظر آتا ہے اور روح نہیں جسم کا بھی قائل ہے اسی لئے اس نظم میں خدا کا تصور بھی شفیق بزرگ جیسا ہے جو پیار کرنے پہ مسکرا دیتا ہے اور حور و ملک کی تصویر خادمانہ رنگ میں رنگی ہوئی ملتی ہے جس سے رومانی نظریہ انوکھا ہی نہیں زندگی سے مانوس بھی ہے۔ مخدوم کا یہ لہجہ اپنے دامن میں محبت کی مٹھاس تو رکھتا ہے اس لئے وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہناتے وقت تہذیب و ثقافت کو نئے پیرائے میں پیش کرنا چاہتے ہیں اور رومان کا نیا پیکر یوں بناتے ہیں:

جو چھو لیتا تھا میں اس کو وہ نہا جاتا پسینے میں

اس مصرعہ میں جہاں روایت سے بغاوت کی ترغیب ملتی ہے وہیں روایت کا احترام بھی ملتا ہے۔ 'طور' ان کی ایک ایسی نظم ہے جو لب و لہجے کے اعتبار سے اور اپنے پلاٹ کے منظر نگاری کے اعتبار سے بھی مخدوم کی انفرادیت کا نقش قائم کرتی ہے اسی لیے مخدوم نے اس نظم کو 'سرخ سویرا' میں سب سے پہلے جگہ دی ہے تا کہ قاری پہلی نظم سے ہی رومان پرور جذبے کی گرفت میں آجائے۔ اس نظم کو سن کر قاضی عبدالغفار جیسے دانشور بھی متاثر ہوئے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''اس نظم کو سن کر قاضی عبدالغفار نے کہا تھا 'خدا اس نئی پود کو پروان چڑھائے جو خدا کے سامنے پیار کرنے سے نہیں جھجکتی اور جس کا خدا بھی اتنا شفیق و مہربان ہے کہ محبت کے اس مظاہرے پر خوش ہوتا ہے۔''(۱)

مخدوم کی باضابطہ شاعری کا آغاز ان کے پہلے شعری مجموعے سے دیکھا جائے تو 'طور' سے ہی ہوتا ہے 'سرخ سویرا' میں ان کی پہلی نظم 'طور' سے یہ الگ بات ہے کہ 'پیلا دوشالہ' ایک اتفاقیہ نظم سے انکا شعری آغاز ہوتا ہے یا کچھ اور دیگر رومانی نظمیں انھوں نے اس زمانے میں کہی تھیں لیکن 'سرخ سویرا' کی اشاعت میں انھوں نے 'طور' کو اولیت بخشی۔

'سرخ سویرا' کے اندر کئی رومانی نظمیں ہیں جن میں سجدہ، انتظار، محبت کی چھاؤں، نامہ حبیب تلنگن، ساگر کنارے، یاد ہے، نورس، پشیمانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ نظمیں ان کے عنفوان شباب کی پیداوار ہیں ان میں جوانی کی گرمی جمالیاتی کیفیت کے ساتھ ملتی ہے۔ جذبات کے شعلے انداز بیان کی ندرت کے ساتھ سلگ اٹھے ہیں۔ چند اشعار پیش ہیں:

انگڑائیاں لیتا ہوا طوفان جوانی
ملتا ہوا آنکھیں اٹھا فتنوں کو جگانے

(ساگر کنارے)

دیکھنے آتے ہیں تارے شب میں سن کر تیرا نام
جلوے صبح و شام کے ہوتے ہیں تجھ سے ہم کلام
دیکھ فطرت کر رہی ہے تجھ کو جھک جھک کر سلام
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

(تلنگن)

یاد آئیں وہ چاندنی راتیں وہ ہنسی چھیڑ دل لگی باتیں
شب تاریک ہے خموشی ہے کل جہاں محو عیش کوشی ہے

(سجدہ)

فرقت کی بھیانک راتوں کا رنگین تصور میں آنا
افشائے حقیقت کے ڈر سے ہنس دینے کی کوشش ہونٹوں میں

(لمحہ رخصت)

ساغر کی کھنک بن گئی اس شوخ کی آواز
بربط کی ہوئی گدگدی یا جاگ اٹھے ساز

(جوانی)

رات بھر سونے نہ دیتی تھی مسرت عید کی
جب کہ رہتی تھی دلوں میں بیقراری دید کی
ماہتاب عید بن جاتی کرن خورشید کی
یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے

(یاد ہے)

رات بھر دیدہ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

(انتظار)

لذت آغوش شب سے تھک گیا ہے ماہتاب
رات کی رانی نے اس سے چھین لی روح شباب

(پچھلے پہر کے چاند سے)

چاہ کا دن ڈھلا شام ہونے لگی
دل دھڑکنے لگا شام ہونے لگی

(محبت کی چھاؤں)

ان اشعار میں زندگی کی رومانی حقیقتیں بڑے فن کارانہ انداز میں اجاگر ہوئی ہیں جوانی کا جوش جذبہ امنگ اور ترنگ سب کچھ ملتا ہے زیادہ تر یہ کیفیت دل کی عامیانہ کیفیت معلوم ہوتی ہے مگر کہیں کہیں اس میں خاص بات بھی نظر آتی ہے مثلاً پچھلے پہر کے چاند سے اور انتظار جیسی نظموں میں مخدوم کی انفرادیت صاف طور پر جھلکتی ہے۔

اب ذرا 'گل تر' اور 'بساط رقص' میں بھی مخدوم کے رومانی انداز کو دیکھنا بہت ضروری ہے 'سرخ سویرا' کے بعد دوسرے شعری مجموعے میں انھوں نے کافی وقت لگایا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مخدوم جب پارٹی سے جڑے اور اس میں ان کے عمل و حرکت میں تیزی آئی تو ایک طرح سے قریب قریب دس برسوں تک انھوں نے شاعری چھوڑ رکھی تھی لیکن جب وہ پھر شاعری کی طرف آئے تو حالات بالکل مختلف تھے اسی لئے 'گل تر' اور 'سرخ سویرا' کے لب ولہجہ میں زمین و آسمان کا فرق ملتا ہے۔ آگے میں نے 'سرخ سویرا' کے حوالے سے مخدوم کے رومانی انداز کو پیش کیا ہے اب ذرا اسی رومانی انداز کو 'گل تر' اور 'بساط رقص' میں دیکھئے جہاں یہ کیفیت بالکل بدل سی گئی ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

اک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دور اس موڑ پر
دو بدن
پیار کی آگ میں جل گئے

(چارہ گر)

زندگی لطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے حسرت دیدار بھی ہے
زہر بھی آب حیات لب و رخسار بھی ہے
زندگی خار بھی ہے زندگی دار بھی ہے

(آج کی رات)

وہ روپ رنگ راگ کا پیام لے آ گیا
وہ کام دیو کی کمان ، جام لے کے آ گیا
وہ چاندنی کی نرم نرم آنچ میں تپتی ہوئی
سمندروں کے جھاگ سے بنی ہوئی جوانیاں
ہری ہری روش پہ ہم ودم بھی ہم کلام بھی

(رقص)

اے دل نارسا آج اتنا مچل
مست آنکھوں کی جھیلوں میں کھلنے لگیں آنسوؤں کے کنول
مل گیا راہ میں اجنبی موڑ پر کوئی جان غزل

(جان غزل)

دل بڑھاتی رہیں ہاتھ کی نرمیاں
پیار کی چاندنی جگمگاتی رہی

(پیار کی چاندنی)

دہر میں لطف وعطا کچھ بھی نہیں
دہر میں مہر و وفا کچھ بھی نہیں
سجدہ کچھ بھی نہیں نقش پا کچھ بھی نہیں
میرے دل اور دھڑک
شاخ گل
اور مہک اور مہک

(احساس کی رات)

'سرخ سویرا' اور اس کے بعد کی شاعری 'گل تر' اور 'بساط رقص' کی رومانی نظموں میں لہجے کا فرق صاف طور پر نظر آتا ہے۔ 'سرخ سویرا' میں مخدوم کا لہجہ سیدھا اور سپاٹ لہجہ ہے جب کہ 'گل تر' اور 'بساط رقص' میں یہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ یہاں علامت اور رمز وکنایہ زبان میں داخل ہو جاتے ہیں اور موضوعات بھی بدل جاتے ہیں۔ 'سرخ سویرا' کی شاعری میں امنگ، جوش اور امید کے پیکر ملتے ہیں جن میں حوصلہ اپنے عروج پر دکھائی دیتا ہے مگر 'گل تر' اور 'بساط رقص' میں شکست وریخت کی آواز سنائی دیتی ہے جن میں رموز وعلائم نے دکھ درد کا رس گھول کر ان کی آواز کو حزن وملال کا سر عطا کر دیا ہے جس سے اس میں محبت کی دلکشی اور غم انگیزی بڑھ گئی ہے اور اس کی معنویت آفاقی ہو گئی ہے۔ ان کی نظم 'رقص' کا آخری شعر ہے۔

الٰہی یہ بساط رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامراں ہو کوہکن کی جیت ہو

ڈاکٹر محمد فیروز کا خیال ہے:

''یہاں 'کوہکن' مزدور کی علامت ہے اور صدائے تیشہ مزدور کی محنت ہے جس سے مراد یہ ہے کہ مزدور کو اس کی محنت کا خاطر خواہ صلہ ملے اور مزدور ایک کامیاب زندگی گزارے۔ یہاں مخدوم نے فرہاد شیریں کی تلمیح سے استفادہ کیا ہے وہ بھی اس لیے کہ فرہاد کوہکن کی شکل میں ایک مزدور تھا جو دن رات مشقت کر رہا تھا لیکن شدید محنت کے بعد بھی وہ ناکام اور محروم رہا۔ فرہاد کوہکن کے روپ میں مخدوم کو زیادہ عزیز ہے۔''(۲)

مخدوم نے کئی نظموں میں فرہاد کے کردار کو علامت یا استعارہ بنا کر پیش کیا ہے ان کی نظموں میں تیشہ زنی اور صدائے تیشہ جیسے الفاظ بار بار آئے ہیں لیکن وہ رومانی زندگی کے لئے گاؤں کی فضا کو پسند کرتے تھے۔ عبدالحئی نے اپنے تازہ ترین مضمون میں ایک جگہ لکھا ہے:

''مخدوم کو گاؤں کی سیدھی سادی زندگی، صاف ستھری فضا، لہلہاتے کھیت اور خوب صورت وادیاں بہت پسند تھیں۔ تمکنت، وہ اور انتظار جیسی نظموں میں گاؤں کی خوب صورت فضا کے ساتھ ساتھ محبت اور شگفتہ احساسات کے ایسے جذبوں کا تاثر ملتا ہے جو کسی بھی انسان کے لیے ایک خوشنما احساس لے کر آتے ہیں۔''(۳)

مخدوم کی رومانی نظموں میں محبت کے وہ سارے موضوعات ملتے ہیں جو انسان کی عام زندگی سے جڑے ہوئے ہیں اور نوجوانی میں خاص کر اس کی ایک الگ تاثیر ہوتی ہے لیکن مخدوم کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ نہ تو اختر شیرانی کی طرح راہ فرار تلاش کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہی میراجی اور ن۔م۔ راشد کی طرح جنسی تلذذ میں ڈوب جاتے ہیں۔

ترقی پسند دور کے دیگر ممتاز شعرا کی طرح مخدوم کے یہاں بھی رومان اور انقلاب کا تصور گھل مل کر ابھرتا ہے مگر مخدوم کی انفرادیت اپنی الگ شان رکھتی ہے خلیل الرحمن اعظمی نے اس بات کی نشاندہی اس طرح کی ہے:

''مخدوم کے مزاج میں غنائیت کے عناصر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے عملی زندگی میں انقلابی سپاہی ہوتے ہوئے اپنی نظموں کو واعظانہ انداز اور خشکی اور کرختگی سے بچالیا۔ ممتاز حسین نے بڑی خوبی سے ایک مضمون میں سردار جعفری اور مخدوم کی انقلابی شاعری کے بنیادی فرق کو واضح کر کے بتایا ہے کہ کیوں کر تغزل کے عناصر کی وجہ سے مخدوم کی نظمیں فن کا خوب صورت نمونہ بن جاتی ہیں اور انھیں موضوعات پر سردار جعفری کی آواز خطابت کا روپ دھار لیتی ہے۔''(۴)

مخدوم کی انقلابی آواز کی گونج 'سرخ سویرا' ہی سے سنائی دینے لگتی ہے اس لئے کہ وہ انقلاب کا صرف نعرہ بن کر نہیں آئے تھے بلکہ عملی طور پر بھی اس میدان میں کوشاں تھے۔ 'سرخ سویرا' میں انکے انقلاب کی آواز 'باغی' سے سنائی دیتی ہے:

رعد ہوں برق ہوں بے چین ہوں پارا ہوں میں
خود پرستار، خود آگاہ، خود آرا ہوں میں
گردن ظلم کٹے جس سے وہ آرا ہوں میں
خرمن جور جلادے وہ شرارا ہوں میں
میری فریاد پہ اہل دول انگشت بدوش
لا، تہر خون کے دریا میں نہانے دے مجھے

اس نظم کے بارے میں سید احتشام حسین کی رائے ملاحظہ کریں:

''رومانیت کا فطری انداز، جوانی کے تقاضے ٹیگور اور ورڈس ورتھ سے دلچسپی کا نتیجہ یہ تھا کہ حقیقتوں کو تخیل کی راہ سے پانے کا رجحان نمایاں ہوگیا۔ یہاں تک کہ جب ہندستان کی سیاسی جدوجہد نے بغاوت کی راہ دکھائی تو اس میں تخیلی اور جذباتی وفور اظہار پر حاوی ہے۔ وہ نظم جس کا عنوان 'باغی' ہے قطعاً اسی سلسلہ کی ایک کڑی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں خود پرستاری ایک خامکار سیاسی ذہن پر چھائی ہوئی ہے اور اظہار کو غصہ اور جوش میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اس موضوع پر جوش، احسان دانش، مجاز، سردار جعفری سبھی کی ابتدائی نظمیں شعور پر جذبہ کے غلبہ کی غماز ہیں۔ اس کی نفسیاتی اور سیاسی توجیہہ کچھ ایسی مشکل نہیں ہے۔ اشارہ صرف اس بات کی طرف کرنا ہے کہ ذہنی ارتقا کی اس منزل میں فکری یا فنی پختگی کی جستجو تحصیل حاصل ہے تاہم جو چیز نمایاں ہے وہ ایک خاص قسم کا صحت مند جذباتی توازن ہے جو عمر کی فطری کیفیات سے ہم آہنگ کہا جا سکتا ہے۔''(۵)

مخدوم کا باغیانہ تیور 'سرخ سویرا' میں 'باغی' سے ملتا ہے اور جنگ، مشرق، موت کا گیت، دھواں، آزادی وطن، جہان نو، حویلی، روح فغفور، زلف چلیپا، سپاہی، انقلاب، اندھیرا، جنگ آزادی وغیرہ میں یہی تیور انقلاب کی آواز بن جاتا ہے۔ ان کے باغی لہجے کے چند نمونے پیش ہیں:

نکلے دہان توپ سے بربادیوں کے راگ
باغ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ
کیوں ٹمٹما رہی ہے یہ پر شمع زندگی ؟
پھر کیوں نگار حق پہ ہیں آثار بیوگی ؟

اب دلہنوں سے چھین لیا جائے گا سہاگ
اب اپنے آنسوؤں سے بجھائیں وہ دل کی آگ

انسانیت کے خون کی ارزانیاں تو دیکھ
اس آسماں والے کی بیدادیاں تو دیکھ
(جنگ)

جہل و فاقہ، بھیک، بیماری، نجاست کا مکاں
زندگانی، تازگی، عقل و فراست کا مسان

چڑ چکے ہیں دست و بازو جس کے اس مشرق کو دیکھ
کھیلتی ہے سانس سینے میں مریض دق کو دیکھ

اس زمین موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا

اک نئی دنیا ، نیا آدم بنایا جائے گا
(مشرق)

ظلمت کفر کو ایمان نہیں کہتے ہیں
سگ خونخوار کو انسان نہیں کہتے ہیں
دشمن جاں کو نگہبان نہیں کہتے ہیں
جاگ اٹھنے کو ہے اب خوں کا تلاطم دیکھو
ملک الموت کے چہرے کا تبسم دیکھو
(موت کا گیت)

جنتیں خاک پی جس رات اتر آئی تھیں
بدلیاں رحمت یزداں کی جہاں چھائی تھیں

خون دہقاں میں امارت کے سفینے تھے رواں
ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں
(دھواں)

کہو ہندوستاں کی جئے کہو ہندوستاں کی جئے
قسم ہے خون سے سینچے ہوئے رنگیں گلستاں کی
قسم ہے خون دہقاں کی قسم خون شہیداں کی
یہ ممکن ہے کہ دنیا کے سمندر خشک ہوجائیں
یہ ممکن ہے کہ دریا بہتے بہتے تھک کے سو جائیں
جلانا چھوڑ دیں دوزخ کے انگارے یہ ممکن ہے
روانی ترک کر دیں برق کے دھارے یہ ممکن ہے
(آزادی وطن)

ایک بوسیدہ حویلی یعنی فرسودہ سماج
لے رہی ہے نزع کے عالم مردوں سے خراج
اک مسلسل کرب میں ڈوبے ہوئے سب بام و در
جس طرف دیکھو اندھیرا جس طرف دیکھو کھنڈر
ہاں وہ نغمہ چھیڑ جس سے مسکرائے زندگی
تو بجائے ساز الفت اور گائے زندگی
آ انھیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں
(حویلی)

یہ کس غریب کے سینے میں ہوک اٹھتی ہے
لرز رہا ہے محل تھرتھرا رہا ہے ہے قمر
اداس رات ہے افلاس ہے غلامی ہے
کفن سے منھ کو نکالے ڈرا رہا ہے قمر
(قمر)

دختر خواجگی روح غارت گری
موت کی ہم سفر مرگھٹوں کی پری
جہل و افلاس کے تخت پر جلوہ گر
کچھ پجاری ادھر کچھ پجاری ادھر

پشت گیتی پہ میں بھی تو ناسور ہوں
دیکھ تو کون ہوں روح فغفور ہوں
(روح فغفور)

ان اشعار میں مخدوم کے وہ انقلابی تیور پائے جاتے ہیں جو ان کے نظریے اور عمل کی بخششیں ہیں ان کے اندر نہ صرف انقلاب کی گھن گرج ہے بلکہ ان اشعار میں سماجی و سیاسی شعور کی اپج بھی ہے۔ ملک اس دور میں جن مسائل سے دوچار تھا وہ ساری باتیں ان اشعار میں نظر آتی ہیں۔ جنگ کے شدید نقصانات، بھوک، غریبی، جہالت، استحصال، غلامی کا دکھ، آزادی کی خواہش، فرسودہ روایتوں کی زنجیریں، سیاسی کشمکش کی تصویریں ان سب کو مخدوم نے 'سرخ سویرا' میں بہتر ڈھنگ سے پیش کیا ہے انقلاب کے تمام موضوعات نہ صرف ان کے نظریے کی غماز بلکہ انسانی زندگی کو بہتر بنانے میں گامزن بھی نظر آتے ہیں۔ 'سرخ سویرا' کی نظمیں صحت مند جذبات کو توازن لیے ہوئے ہیں جنھیں عقیدہ کی گرمی نے خوبصورت بنا دیا ہے۔

مخدوم کے 'سرخ سویرا' کے بعد کی شاعری پر احتشام حسین کی رائے بہت ٹھوس اور واضح ہے۔ وہ مخدوم کی اس تبدیلی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مخدوم فن اور عقیدہ دونوں کے باطنی رشتہ سے واقف ہیں اس لیے انھیں ڈوب کر ابھرنے میں دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ 'گل تر' کی اکثر و بیشتر نظمیں اور غزلوں کے بہت سے اشعار اسی جہد حیات کی علامتی تصویر ہیں۔''(۶)

اس کا احساس مخدوم کو خود بھی تھا۔ اس لئے انھوں نے 'گل تر' میں اس کا اعتراف اس طرح کیا ہے۔

''شعر کہنے کی طرح شعر پڑھنا خود ایک تخلیقی عمل ہے شعر کہتے ہوئے شاعر اپنے آپ کو بھی بدلتا ہے بلکہ وہ اختراع کرتا ہے۔ اپنے تجربے کی بنا پر جب آپ 'گل تر' پڑھیں تو شاید آپ بھی اس عمل سے گزریں۔ ذہن 'سرخ سویرا' اور 'گل تر' میں مقابلہ بھی کرنے لگے گا شاید یہ خیال بھی آئے گا کہ کلام کا یہ مجموعہ اپنی سج دھج نفس مضمون حقیت، ندرت، جمالیاتی کیفیت وکیت اور تاثر تاثر کے اعتبار سے 'سرخ سویرا' سے مختلف ہے۔''(۷)

اور مزید یہ بھی لکھتے ہیں:

''یہ فرق میری نظر میں ایک نیا پن ہے جو عمر، تجربہ اور خود عہد حاضر کی نوعیت کے اپنے ماسبق سے مختلف ہونے کا نتیجہ ہے جو سماجی اور شعوری ارتقا کی نشاندہی کرتا ہے پھر بھی انسان دوستی اور سمٹا ہوا جمالیاتی اثر قدر مشترک ہے۔''(۸)

'سرخ سویرا' میں مخدوم نے جہاں سپاٹ لہجے میں اپنی بات بیان کرتے ہیں وہیں 'گل تر' میں انھوں نے رموز وعلائم سے کام لیا ہے اور ان کی طاقت بھی شعری بیان کے مطابق پہچاننے کی کوشش کی ہے موضوعات اور مسائل قریب قریب ویسے ہی ہیں لیکن انھیں بیان کرنے کا انداز بالکل الگ تھلگ ہے اس مجموعے میں جو نظمیں قابل ذکر ہیں یا فکر وفن کی بہترین نمونہ ہیں ان میں قید، چارہ گر، چاند تاروں کا بن، رقص، چپ نہ رہو، لخت جگر، نیا سال وغیرہ ہیں۔

'چاند تاروں کا بن' ان کی ایک بہترین نظم ہے جس پر بہت سارے دانش

وروں نے اپنی بات کہی ہے۔احتشام حسین اس سلسلہ میں اپنے خیال کو یوں پیش کرتے ہیں:

''مخدوم کے یہاں ایک صحت مند توازن ہے جو عقیدے کی گرمی سے پیدا ہوا ہے اس کی ایک روشن مثال 'چاند تاروں کا بن' ہے اس مختصر نظم کے تینوں حصے کم سے کم جگہ میں بہت سے حقائق کو سمیٹ لیتے ہیں اور اندھیروں سے گزرتے ہوئے مستقبل پر نگاہ جمائے رہتے ہیں۔اس نظم کے لفظ لفظ میں علامتی تاثر اور فکری گہرائی نے نئی قوت پیدا کردی ہے۔آزادی سے پہلے کی تشنگی اس تشنگی سے مختلف تھی جو آزادی کے بعد پیدا ہوئی۔بیرونی سیاست نے آزادی کی روشنی کو تاریکی میں کس طرح بدل دیا یہ لطیف بیان اظہار کا معجزہ معلوم ہوتا ہے۔''(۹)

مخدوم کی انقلابی آواز وقت کے سانچے میں ڈھلتی نہیں ہے ہاں اتنا ضرور ہوا ہے کہ 'سرخ سویرا' جس میں آغاز جوانی کی شاعری تھی اس سے مختلف شاعری بعد کے دونوں شعری مجموعوں میں نظر آتی ہے۔ان دونوں شعری مجموعوں میں وہ لہر اور دھار تو نہیں رہتی جو 'سرخ سویرا' میں ہے لیکن 'گل تر' میں مشاہدہ اور تجربہ رموز وعلائم کی شکل اختیار کر جاتے ہیں اور زمان ومکان کی حدود سے باہر نکل جاتے ہیں۔

مخدوم کی شاعری میں جہاں رومانی،انقلابی،سیاسی،سماجی ومعاشرتی موضوعات ملتے ہیں وہیں انھوں نے شخصی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ان کی شخصی وتاثراتی نظموں پر شاذ تمکنت نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے:

''مخدوم نے جن شخصیتوں کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے ان میں شاعر اور سیاسی شخصیتیں شامل ہیں مثلاً ایک طرف ولی ،غالب اور اقبال پر نظمیں ملتی ہیں تو دوسری طرف استالن،لومبا ،نہرو،مارٹن لوتھر کنگ سے دلی وابستگی کا اظہار ملتا ہے ان کے علاوہ دو تہذیبی کردار 'بھاگ متی' اور 'لگارن' ملتے ہیں جنھیں مخدوم نے سراہا ہے۔''(۱۰)

ان کے علاوہ اپنے بچے کے انتقال پر 'پرسہ' کے نام سے بھی ایک نظم لکھی ہے اور آمنہ کی پیدائش کے موقع پر بھی ایک شعر کہا ہے۔

شخصی وتاثراتی نظموں میں عام طور پر خارجی محبت کا اظہار ملتا ہے،بہت کم شعرا اپنے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے شخصی تاثر کو بہتر طریقہ سے شعر میں ادا کرنے کی صلاحیت جٹا پاتے ہیں لیکن مخدوم یہاں بھی کامرانی کے ساتھ گزرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

'سرخ سویرا' کی پہلی شخصی نظم 'ولی' ملتی ہے جس میں انھوں نے ولی کی شخصیت کے کئی نئے گوشوں کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ولی کو کس طرح سے انھوں نے پیش کیا ہے،دیکھئے:

جہان رنگ و بو سے کھیلنے والا نہ تھا کوئی
شب ہجراں کی سختی جھیلنے والا نہ تھا کوئی
صدا دی آسمانوں نے ستاروں نے ولی آیا
مبارکبادیاں گائیں ، بہاروں نے ولی آیا
ولی وہ ہمدم فطرت ، وہ پیک نور وجدانی
وہ جبریل سخن وہ اولیں تلمیذ رحمانی
یقیں بخشا زباں کو جس نے پہلے اس کے جینے کا
وہ پہلا ناخدا 'ہندوستانی' کے سفینے کا
دیے روشن کیے مندر میں کعبے کے چراغوں سے
ہزاروں جنتیں آباد کردیں دل کے داغوں سے
وہ میراث جہاں وہ خلد کا پیغام آتا ہے
دکن کی سر زمیں پر زندگی کا جام آتا ہے

'چارہ گر' بھی مخدوم کی ایک نہایت اہم کامیاب رومانی نظم ہے جس میں انھوں نے علامت کے ذریعہ معنی کو وسیع قالب میں ڈھال دیا ہے۔مخدوم کی شاعری میں غنائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے آزاد شاعری کے بارے میں اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں موسیقیت نہیں ہوتی لیکن مخدوم نے 'چارہ گر' کے حوالے سے اس خیال کو جھوٹا ثابت کردیا ہے اس لیے کہ جب یہ نظم موسیقی کے سانچے میں ڈھلی تو اور خوبصورت ہوگئی یعنی اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے اسی لیے مرزا ظفر الحسن اس بارے میں لکھتے ہیں:

''فلمی دنیا میں ایک سے ایک بڑا شاعر ہے اور بڑے بڑوں نے بھی فلمی گانے لکھے ہیں مگر ان میں ایسا نہیں کہ کسی فلمی گانے کو ادب پارہ کہہ کر صاحبان علم کی محفل میں سنانے کی جرات کر سکے مگر چنبیلی کے منڈوے تلے کا خالق یہ کر چکا ہے۔اسی طرح کسی چھوٹے بڑے شاعر کی ایک بھی نظم ایسی نہیں ہے جو پہلے ادب کی محفل میں پڑھی اور پسند کی گئی ہو اور بعد میں فلمی دنیا کی ملک بھی ہو۔یہ امتیاز صرف مخدوم کی نظموں کو حاصل ہے۔''(۱۱)

مجروح،ساحر اور کیفی اعظمی نے بھی کئی کامیاب فلمی گیت لکھے لیکن ان کے فلمی نغمے الگ ہیں اور ادبی شہ پارے الگ۔مخدوم چونکہ فلمی شاعر نہیں تھے ان کے غنائی لہجے نے فلم والوں کو متاثر کیا اور 'چارہ گر' کو فلم میں ریکارڈ کیا گیا۔مجاز کی شہرہ آفاق نظم 'آوارہ' کو بھی فلمی موسیقی سے سجایا گیا لیکن مخدوم جیسی مقبولیت نہیں ہو سکی ۔لیکن مخدوم کی 'چارہ گر' کی فلمی مقبولیت کی وجہ اس کا غنائی لہجہ ہے لیکن ادبی مقبولیت اس نظم کی معنویت اور علامتی اظہار کا خوبصورت نمونہ ہے جس میں سیاسی فکر کر اس طرح برتا گیا ہے کہ وہ بظاہر رومانی اور عشقیہ موضوع نظر آتا ہے لیکن اگر غور وفکر کیا جائے تو پس پردہ بات کچھ اور نظر آتی ہے۔مثال کے طور پر 'چارہ گر' کا یہ بند دیکھئے:

مسجدوں کے منارے نے دیکھا انھیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انھیں
میکدوں کی دراڑوں نے دیکھا انھیں
از ازل تا ابد
یہ بتا چارہ گر
میری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے
کچھ علاج مداوائے الفت بھی ہے

تقسیم وطن کا یہ وہی دکھ ہے 'جو چاند تاروں کا بن' میں پورے تاثر کے ساتھ بیان ہوا

ہے لیکن اس نظم میں رومانی فضا نے ابتدا میں علامتی اظہار کے پیرائے میں بہت خوبصورت مناظر پیش کیے ہیں؛

دو بدن
اوس میں بھیگتے چاندنی میں نہاتے ہوئے
جیسے دو تازہ دم پھول پچھلے پہر
ٹھنڈی ٹھنڈی سبک رو چمن کی ہوا

ان مصرعوں سے ذہن رومانی مناظر کے تجسس میں کھو جاتا ہے لیکن اس نظم کی ماتمی فضا صرف دو بدن کا المیہ نہیں ہے بلکہ یہ دو قوموں کا غم ہے جو تقسیم وطن کے بعد ابھرتا ہے۔ حسن فرخ اس نظم پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مخدوم کے اس روحانی سفر کی معراج نظم 'چارہ گر' ہے اس نظم میں انھوں نے سماجی پابندیوں کے علاوہ مذہبی پابندیوں کا بھی ذکر کیا ہے جو مجسم آنکھ بنی محبت کے جذبوں کی نگرانی کرتی رہتی ہے ان تمام گرہوں اور زنجیروں کو کھولتے ہوئے اور کاٹتے ہوئے بھی انھوں نے نظم اس سوال پر ختم کی ہے؛

یہ بتا چارہ گر
میری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے
کچھ علاج مداوائے الفت بھی ہے" (۱۲)

عالم خوندمیری نے کہا ہے کہ مخدوم کی نظم 'چارہ گر' کے دو بدن انسانی محبت کے ازلی اور ابدی حزیے کی علامت ہیں؛ بے شک عالم خوندمیری کا خیال صحیح ہے کہ 'طور' میں جس محبت کے کردار ملتے ہیں 'چارہ گر' میں وہ کردار بالکل بدل جاتے ہیں وہاں نشاطیہ ہم آہنگی ہے جب کہ یہاں حزنیہ کیفیت ہے اس لئے 'طور' نے پیار کرنے والوں پہ خدا بھی مسکراتا ہے۔ حوریں بھی غزل خواں ہیں ملک بھی جھولا جھلانے میں لگے ہوئے ہیں یہ ساری کیفیت نشاطیہ ہے۔ وہاں زندگی مسکراتی، گاتی اور رقص کرتی ہوئی نظر آتی ہے لیکن یہاں محبت کرنے والوں کی دنیا عجیب ہے یہاں سماجی بندشیں ہیں، مذہبی رکاوٹیں ہیں ہر قدم پر نفرت کی دیوار ہے اس لئے اس نظم میں زندگی تلخ نظر آتی ہے اور اسے سکون موت کی آغوش میں ملتا ہے۔

مخدوم کی ایک نظم 'لخت جگر' ہے جس میں انھوں نے محبت کے رشتے اور سماجی مسائل کو انتہائی فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے اور اس نظم میں ماں کی مجبوریوں اور بیٹے کی سماجی صداقت کو مریم اور عیسیٰ کے واقعہ سے جوڑ کر نئی تہذیبی فضا ہموار کرنے کی کوشش کی ہے۔ مخدوم کی نظموں میں سیاسی، انقلابی، ترقی پسندی اور رومانی وعشقیہ اثرات شروع ہی سے پائے جاتے ہیں۔ 'سرخ سویرا' میں اس کی دوسری کیفیت ملتی ہے جب کہ 'گل تر' اور 'بساط رقص' میں ان کا انداز جداگانہ ہے۔

'سرخ سویرا' میں رومانی نظموں میں طور، ساگر کنارے، تلنگن، ہجد و، لمحہ رخصت، انتظار، پچھلے پہر کے چاند سے، برسات، انتساب، نیند اور پشیمانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ترقی پسندی، سیاسی اور انقلابی اثرات لیے ہوئے نظموں میں باغی، میں، جنگ، مشرق، موت کا گیت، دھواں، حویلی، مسافر، قمر، روح فغفور، زلف چلیپا، سپاہی، اندھیرا، جنگ آزادی اور استالن جیسی نظمیں ہیں۔ عزیز احمد کے رائے سے اس سلسلہ میں اتفاق کیا جا سکتا ہے؛

"مخدوم محی الدین کی شاعری تمام انقلابی شاعری کے مقابل اپنے خلوص، جوش، کردار اور انقلابی جدت کی وجہ سے ممتاز ہے۔ خالص شاعری کی حیثیت سے بھی اس کے کھرے ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا اور یہ زبان، محاورے اور اوزان کی بے شمار غلطیوں کے باوجود نظمیں تھوڑی ہی ہیں لیکن وہ عشقیہ ہوں یا انقلابی ایک آتش فشاں اندورنی حرارت ایک سچا مخلص جذبہ ان کا محرک ہے۔" (۱۳)

لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد کی جو شاعری ہے مخدوم کے یہاں اس میں بہت بڑی تبدیلی نظر آتی ہے مخدوم نے اس کا اظہار 'گل تر' کے دیباچے میں بھی کیا ہے۔ پروفیسر عقیل احمد صدیقی اس تبدیلی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"۱۹۴۷ء کے بعد جن ترقی پسند شاعروں نے نئے نئے لہجے سے اردو نظم کو سنوارا ہے ان میں مخدوم اور سردار جعفری اہمیت رکھتے ہیں۔ دراصل ۱۹۴۷ء کے بعد سماجی صورت حال نے جہاں نئی ادبی اور سماجی تحریکوں کے لیے راہیں ہموار کیں وہیں ترقی پسندوں کو بھی متاثر کیا۔ ترقی پسند ادیبوں نے اپنے فکری اور فنی رویوں میں تبدیلی پیدا کی جو زیادہ حقیقت پسند ہے۔ یوں تو ابتدا میں بھی ترقی پسند تحریک کا نمایاں مقصد 'حقیقت نگاری' تھا لیکن نظریہ کی اعادیت نے ادیبوں سے پارٹی اصول کے مطابق ادب لکھوایا جو ہنگامی اہمیت کا حامل ضرور تھا لیکن ان میں ادبیت کی کمی تھی ۱۹۴۷ء کے بعد فکری طور پر حقیقت نگاری کو رواج ملا اور شعرا اپنے انفرادی وژن کی روشنی میں حالات کا جائزہ لینے لگے اور فن میں نئی راہیں تلاش کرنے لگے۔"
(۱۴)

مخدوم کی 'گل تر' میں شامل نظمیں اس تبدیلی کا بین ثبوت ہیں۔ 'سرخ سویرا' میں ان کا باغیانہ لہجہ بے نیام تلوار کی دھار کی طرح تیز اور کھلا ہوا ہے اور عشق معصوم اداؤں کا تمنائی مگر 'گل تر' میں یہی لہجہ تبدیل ہو گیا ہے اور تلوار نیام کے اندر ہے اور عشق کی زندگی کی حقیقتوں پر کچھ سوچنے کو مجبور ہے۔

اشاریات / حوالہ جات::::

(۱) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک / خلیل الرحمن اعظمی / ص ۱۴۰
(۲) کلیات مخدوم (مرتب: فاروق ارگلی) فرید بک ڈپو نئی دہلی / ۲۰۰۷ء / ص ۳۴
(۳) اردو دنیا (فروری ۲۰۱۲ء) ص ۴۷
(۴) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک / خلیل الرحمن اعظمی / ص ۱۴۳
(۵) کلیات مخدوم (مرتب: فاروق ارگلی) فرید بک ڈپو نئی دہلی ۲۰۰۷ء / ص ۸۵،۸۴
(۶) کلیات مخدوم (مرتب: فاروق ارگلی) فرید بک ڈپو نئی دہلی ۲۰۰۷ء / ص ۹۰
(۷) کلیات مخدوم (مرتب: فاروق ارگلی) فرید بک ڈپو نئی دہلی ۲۰۰۷ء / ص ۴۳
(۸) کلیات مخدوم (مرتب: فاروق ارگلی) فرید بک ڈپو نئی دہلی ۲۰۰۷ء / ص ۳۶
(۹) کلیات مخدوم (مرتب: فاروق ارگلی) فرید بک ڈپو نئی دہلی ۲۰۰۷ء / ص ۹۲،۹۰
(۱۰) مخدوم: حیات اور کارنامے / شاذ تمکنت (۱۹۸۹ء) / ص ۱۹۷
(۱۱) ماہنامہ صبا (مخدوم نمبر اکتوبر۔نومبر۔دسمبر ۱۹۶۹ء) / ص ۱۷۳،۱۷۲
(۱۲) ماہنامہ صبا (مخدوم نمبر اکتوبر۔نومبر۔دسمبر ۱۹۶۹ء) / ص ۱۵۳
(۱۳) ماہنامہ صبا (مخدوم نمبر اکتوبر۔نومبر۔دسمبر ۱۹۶۹ء) / ص ۵۱
(۱۴) جدید اردو نظم: نظریہ و عمل / پروفیسر عقیل احمد صدیقی / ص ۱۳۷

• • •